کریڈٹ

نوٹ:
سوال
سوال
سوال
سوال
سوال

ANS 01

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ ہر مرض کی دوا، ہر مسئلے کا حل اور ہر چیلنج کا جواب ہے، لیکن مسلمانوں نے سیرتِ طیبہ کے ساتھ اپنے تعلق کو خود ایک مسئلے اور چیلنج میں ڈھال لیا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ کمزور سے کمزور مسلمان بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جان دینے پر آمادہ ہوسکتا ہے، اور اچھے اچھے مسلمان بھی سیرتِ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ سوال یہ ہے کہ اس کا سبب کیا ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ جان دینے کے لیے ایک لمحہ درکار ہوتا ہے لیکن سیرتِ طیبہ کو پوری زندگی ہر لمحہ بسر کرنا پڑتا ہے اور اس کام میں محنت لگتی ہے، اس سلسلے میں مشقت اٹھانی پڑتی ہے۔ لیکن مسلمانوں کے لیے محنت اور مشقت اس لیے آسان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ شدید ترین محنت اور مشقت کا سب سے بڑا نمونہ ہے۔ اس نمونے میں محنت اور مشقت... محنت اور مشقت نہیں رہتی... زندگی بن جاتی ہے، زندگی کی شرط کہلاتی ہے، اس کا حسن و جمال نظر آتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبادت میں اتنی مشقت فرماتے کہ آپؐ کے پیروں میں ورم آجاتا۔ صحابہ کرامؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حال میں دیکھتے تو فرماتے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف کردیے ہیں تو پھر آپؐ عبادت میں اتنی شدید محنت کیوں کرتے ہیں؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا جو جواب دیا ہے انسانی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہ کروں! اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محنت و مشقت صرف عبادت تک محدود نہیں تھی۔ جب صحابہ کرامؓ پیٹ پر ایک پتھر باندھتے تھے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شکمِ مبارک پر دو پتھر بندھے ہوتے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے وعدہ کیا تو تین دن تک اس شخص کا مقامِ مقررہ پر انتظار فرماتے رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غزوات میں شریک ہوتے تھے، میدانِ جنگ میں اُس مقام پر کھڑے ہوکر جہاد فرماتے جہاں جان کو سب سے زیادہ خطرات ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ میں سے سب

سے بہادر اُس شخص کو سمجھا جاتا تھا جو میدانِ جنگ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے زیادہ قریب ہوتا تھا۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو سیرتِ طیبہ مسلمانوں کی بے عملی کے مرض، مسئلے اور چیلنج کا سب سے شاندار جواب ہے۔

غلامی اور مغربی مفکرین کے زیراثر مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے میں یہ احساس پیدا ہوا کہ اسلام اور سیرتِ طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو سال ''پرانی'' چیز ہیں، چنانچہ وہ جدید عہد میں ہمارے اس طرح کام نہیں آسکتے جس طرح چودہ سوسال پہلے کام آتے تھے۔ لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف باعثِ تخلیقِ کائنات اور سردارالانبیاء ہی نہیں ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین بھی ہیں اور ختمِ نبوت کے بہت سے مفاہیم میں سے ایک مفہوم یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ بیک وقت قدیم بھی ہیں اور جدید بھی۔ اسلام اور علم دشمن طاقتیں الزام لگاتی ہیں کہ مسلمان قدامت پسند Orthodox ہیں۔ لیکن اسلام اور سیرتِ طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے قدامت پسند Orthodox ہونے کا مفہوم زیادہ حقیقی یا Original ہونا یا اصل کے زیادہ سے زیادہ قریب ہونا ہے۔ اور جو اصل کے جتنا زیادہ قریب ہے وہ خود کو دریافت کرنے یا Re-Invent کرنے کی اتنی ہی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ اتنا ہی جدید اور تخلیقی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کا مفہوم یہ ہے کہ قدیم ہونے کا مفہوم اسلام کی روح سے آگاہ ہونا ہے اور جدید ہونے کا مطلب اس روح کے اظہار کے لیے نئے نئے پیرائے، اسالیب، سانچے اور ڈھانچے بنانے کی اہلیت کا حامل ہونا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ختمِ نبوت کا عقیدہ ایک انقلابی عقیدہ ہے، اور یہ عقیدہ پوری امتِ مسلمہ کو قدیم اور جدید کے درمیان لاکھڑا کرتا ہے۔ اس مقام پر کھڑی ہوکر امتِ مسلمہ ماضی کی قوت سے مستقبل کشید کرتی ہے۔ غورکیا جائے تو سیرتِ طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف اس پہلو میں مسلمانوں کو درپیش کتنے ہی امراض کا علاج، کتنے ہی مسائل کا حل اور کتنے ہی چیلنجوں کا جواب ہے۔

سیرتِ طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کے تعلق کا ایک نفسیاتی پہلو یہ ہے کہ سیرتِ طیبہ مسلمانوں کو اتنی مثالی محسوس ہوتی ہے کہ اس کی پیروی دشوار بلکہ بسااوقات ناممکن محسوس ہوتی ہے۔ مسلمانوں کو لگتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو باعثِ تخلیقِ کائنات تھے، سردارالانبیاء تھے، اللہ کے حبیب تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہر عمل آسان تھا، لیکن ہم تو عام لوگ ہیں، ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی پیروی کہاں تک ہوسکتی ہے! تجزیہ کیا جائے تو یہ بے انتہا تعریف کے پردے میں عمل سے فرار کی ایک کوشش ہے۔ اس چیلنج کا جواب سیرتِ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ملتا ہے کہ بلاشبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم باعثِ تخلیق کائنات ہیں، بلاشبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سردارالانبیاء ہیں، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سب کچھ ہونے کے ساتھ ساتھ بشر بھی ہیں۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بنی نوع انسان کے لیے واجب الاتباع ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر نہ ہوتے تو واجب الاتباع کیسے ہوتے؟ یہاں کہنے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ

علیہ وسلم کی بشریت مجرد نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بشر کی حیثیت سے دنیا کے کسی بھی انسان سے زیادہ مصائب برداشت کیے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے کسی بھی انسان سے زیادہ ستایا گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر دنیا کے کسی بھی انسان سے زیادہ آزمائشیں آئی ہیں۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کی انقلابی شان نمایاں ہوکر سامنے آتی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت امتِ مسلمہ کے بہت سے امراض کی دوا، بہت سے مسائل کا حل اور بہت سے چیلنجوں کا جواب بن جاتی ہے۔

ہمارے عہد کا ایک بڑا چیلنج یہ ہے کہ انسانوں نے طرح طرح کی مصنوعی فضیلتیں ایجاد کرکے انہیں پوری انسانیت کے لیے معیار بنادیا ہے۔ مثال کے طور پر مغرب نے ایک ہی دنیا میں تین دنیائیں تخلیق کر ڈالی ہیں۔ پہلی ترقی یافتہ کہلاتی ہے، دوسری دنیا کو ترقی پذیر دنیا کا نام دیا گیا ہے، جب کہ تیسری دنیا کو پسماندہ یا غریب دنیا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان دنیائوں میں پہلی دنیا کی حیثیت ''جنت'' کی ہے، دوسری دنیا جنت کی طرف سفر سے عبارت ہے، اور تیسری دنیا زمین کا ''جہنم'' ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ان دنیائوں کا فرق صرف نظری نہیں، عملی بھی ہے۔ پہلی دنیا کے لوگ قابلِ احترام ہیں، اس لیے وہ احساسِ تفاخر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ دوسری دنیا کے لوگ پہلی دنیا کے لوگوں کی نقل کرنے والے ہیں اور تہذیب ان کے لیے ایک امکان کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر دوسری دنیا کے لوگ احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں۔ تیسری دنیا کے لوگوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ نہ قابلِ احترام ہیں، نہ مہذب اور نہ ہی اُن کے قابلِ احترام ہونے کا کوئی امکان ہے۔ چنانچہ یہ لوگ صرف احساسِ کمتری میں نہیں احساسِ جرم میں بھی مبتلا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان تمام امتیازات کی بنیاد اقتصادیات اور معاشیات ہے۔ لیکن یہ انسانوں کو ناپنے تولنے کا واحد مصنوعی معیار ہے۔ ایک معیار جمہوریت ہے۔ جو اقوام جمہوری ہیں انہیں تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اور جو اقوام جمہوری نہیں ہیں انہیں دنیا حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔
اسی طرح ایک معیار سائنس اور ٹیکنالوجی ہے۔ جو اقوام سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کرچکی ہیں انہیں دنیا میں ''امامت'' کا درجہ حاصل ہے، اور جو اقوام سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی یافتہ نہیں انہیں ''مقلد'' بھی سمجھ لیا جائے تو غنیمت ہے۔ دنیا کی کتنی ہی اقوام ہیں جو قومیتوں کے تصور کو سر کا تاج بنائے ہوئے ہیں۔ دنیا میں نسل کے بت کو پوجنے والے بھی کروڑوں میں ہیں۔ اس کے مقابلے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو دوسرے انسان پر صرف ایک حوالے سے فضیلت اور برتری حاصل ہے، اور یہ حوالہ ہے ''تقویٰ''۔ قرآن مجید کی سورۃ الحجرات کی آیت 13 میں ارشاد ربانی ہے:

''اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ تقویٰ والا یا پرہیزگار ہے۔''

ایک حدیث شریف میں آیا ہے:

''اللہ قیامت کے روز تمہارا حسب نسب نہیں پوچھے گا۔ اللہ کے ہاں تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔'' (مسلم، ابن ماجہ)

عصرِ حاضر کا ایک بڑا چیلنج یہ ہے کہ ''وحدتِ انسانی'' کا تصور کم ہوگیا ہے اور بنی نوع انسان مختلف بنیادوں پر نہ صرف یہ کہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ گئے ہیں بلکہ ان کے درمیان جنگ و جدل کا سلسلہ جاری ہے۔

مثلاً کہنے کو یورپی اقوام کی تہذیب اور تاریخ ایک ہے لیکن ایرک فرام نے اپنی تصنیف "The Anatomy of Human Destructiveness" میں لکھا ہے کہ یورپی اقوام نے گزشتہ چار سو برسوں میں 2600 سے زائد جنگیں لڑی ہیں، ان میں بیسویں صدی میں لڑی جانے والی دو عالمیبھی شامل ہیں جو بنیادی طور پر یورپی اقوام کے مابین لڑی گئیں۔ اس منظرنامے میں کوئی وحدت نہیں، کوئی حقیقی آفاقیت، کوئی حقیقی عالمگیریت اور حقیقی بین الاقوامیت نہیں۔

20ویں صدی کے اواخر میں مغرب کی برپا کردہ عالمگیریت(Globalization)کا بڑا شہرہ ہوا، لیکن اس عالمگیریت کی بنیاد محبت، اخوت اور تعاون پر نہیں بلکہ استحصال کے تصور پر رکھی گئی ہے۔ ایک طرف سائنس و ٹیکنالوجی سے لیس اور فوجی، عسکری و معاشی قوت سے مسلح اقوام ہیں، اور دوسری طرف وہ اقوام ہیں جن کے پاس صرف خام مال ہے اور ترقی یافتہ اقوام کی تیار کردہ چیزوں کی صرف ''صارف'' ہیں۔ اس منظرنامے میں طاقت ور اقوام کمزور اقوام کے قریب آرہی ہیں مگر انہیں گلے لگانے کے لیے نہیں، ان کا گلا دبانے کے لیے۔ اس صورتِ حال میں پوری انسانیت کی سلامتی کے لیے سنگین خطرات مضمر ہیں۔

اس کے برعکس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو پیغام لے کر آئے وہ ایک جانب وحدتِ انسانی کی حقیقی بنیادیں فراہم کرتا ہے اور دوسری جانب امتِ مسلمہ کی صورت میں ایک ایسی امت تشکیل دیتا ہے، آفاقیت جس کا خمیر ہے، عالمگیریت جس کا ذوق ہے، بین الاقوامیت جس کا تناظر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کے اراکین کے باہمی تعلق کی نوعیت واضح کرتے ہوئے سورۃ الحجرات میں فرمایا:

''مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں، لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو۔''

حضرت جریر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے تین باتوں پر بیعت لی تھی۔ ایک یہ کہ نماز قائم کروں گا۔ دوسری یہ کہ زکوٰۃ دیتا رہوں گا۔ تیسری یہ کہ مسلمان کا خیرخواہ رہوں گا۔''

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے جنگ کرنا کفر ہے۔''

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی جان، مال اور عزت حرام ہے۔''

حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ وہ اس پر ظلم نہیں کرتا، اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا، اس کی تذلیل نہیں کرتا۔ ایک آدمی کے لیے یہی شر بہت ہے کہ وہ اپنے بھائی کی تحقیر کرے۔''

حضرت سہیل بن ساعدی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ:

''گروہِ اہلِ ایمان کے ساتھ ایک مومن کا تعلق ویسا ہی ہے جیسا سر کے ساتھ جسم کا تعلق ہوتا ہے۔ وہ اہلِ ایمان کی ہر تکلیف کو اس طرح محسوس کرتا ہے جس طرح سرجسم کے ہر حصے کا درد محسوس کرتا ہے۔''

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مومن دوسرے مومن کے لیے اس دیوار کی طرح ہے جس کا ہر حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے۔''

حضرت عبداللہ بن عمر بن عاصؓ نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارکہ ہے:

''مومن وہ ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔''

غور کیا جائے تو یہی وہ تعلیمات ہیں جن کی بنیاد پر انسانی برادری کے درمیان حقیقی محبت اور حقیقی اخوت وجود میں آسکتی ہے، اور یہی وہ نور ہے جو حقیقی آفاقیت، عالمگیریت اور حقیقی بین الاقوامیت کے ذریعے پوری انسانیت کو ایک برادری میں ڈھال سکتا ہے۔

مسلم معاشرے کے لیے ایک بڑا عصری چیلنج یہ ہے کہ مغرب کے آزادئ نسواں کے نعرے کے تحت عورت ڈاکٹر، انجینئر، اداکارہ، گلوکارہ اور ماڈل کے طور پر تو اہم سمجھی جاتی ہے لیکن بیوی اور ماں کی حیثیت سے اس کا کوئی مقام اور مرتبہ نہیں رہا۔ امتِ مسلمہ کے جدید تعلیم یافتہ طبقے میں گھریلو خاتون یا House Wife کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے جیسے وہ کوئی کام ہی نہ کرتی ہو اور معاشرے کو اس کی ضرورت نہ ہو۔ مسلم خواتین بچے پیدا کرنے اور پالنے سے اس طرح گھبرانے لگی ہیں جس طرح مغرب کی خواتین گھبراتی ہیں۔ یہ صورتِ حال مرد وعورت کے تعلق، خاندان اور مسلم معاشرے کی روحانی، نفسیاتی اور جذباتی صحت پر منفی اثرات مرتب کررہی ہے۔ سیرتِ طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم بیوی اور ماں کا مقام انتہائی بلند کرکے نہ صرف یہ کہ اس چیلنج کا نہایت شافی جواب فراہم کرتی ہے بلکہ معاشرے میں خاندان کے ادارے کو اس کی مرکزیت اور وقار بھی عطا کرتی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ تم میں سے بہترین وہ ہے جو اپنی شریکِ حیات کے لیے اچھا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وصال سے ذرا پہلے مسلمانوں کو جن چیزوں کا خیال رکھنے کی تاکید فرمائی ان میں نماز کے ساتھ ساتھ اپنی بیوی کا خیال رکھنے کی تاکید بھی شامل ہے۔

سیرتِ طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم ماں کا یہ مقام متعین کرتی ہے کہ اس کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زچگی، بچوں کو دودھ پلانے اور ان کی دیکھ بھال کرنے میں کہیں جہاد کے برابر ثواب ہے،

کہیں اسلامی ریاست کی سرحدوں کے دفاع کے برابر اجر ہے۔ ان حقائق کو دیکھا جائے تو بیوی اور ماں کی اہمیت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس کے آگے ڈاکٹر اور انجینئر ہونا کیا، ملک کا وزیراعظم ہونا بھی معمولی بات نظر آتی ہے

ANS 02

مسلمانوں نے سیرتِ طیبہ کے ساتھ اپنے تعلق کو خود ایک مسئلے اور چیلنج میں ڈھال لیا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ کمزور سے کمزور مسلمان بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جان دینے پر آمادہ ہوسکتا ہے، اور اچھے اچھے مسلمان بھی سیرتِ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ سوال یہ ہے کہ اس کا سبب کیا ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ جان دینے کے لیے ایک لمحہ درکار ہوتا ہے لیکن سیرتِ طیبہ کو پوری زندگی ہر لمحہ بسر کرنا پڑتا ہے اور اس کام میں محنت لگتی ہے، اس سلسلے میں مشقت اٹھانی پڑتی ہے۔ لیکن مسلمانوں کے لیے محنت اور مشقت اس لیے آسان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ شدید ترین محنت اور مشقت کا سب سے بڑا نمونہ ہے۔ اس نمونے میں محنت اور مشقت... محنت اور مشقت نہیں رہتی... زندگی بن جاتی ہے، زندگی کی شرط کہلاتی ہے، اس کا حسن و جمال نظر آتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبادت میں اتنی مشقت فرماتے کہ آپؐ کے پیروں میں ورم آجاتا۔ صحابہ کرامؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حال میں دیکھتے تو فرماتے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف کردیے ہیں تو پھر آپؐ عبادت میں اتنی شدید محنت کیوں کرتے ہیں؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا جو جواب دیا ہے انسانی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہ کروں! اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محنت و مشقت صرف عبادت تک محدود نہیں تھی۔ جب صحابہ کرامؓ پیٹ پر ایک پتھر باندھتے تھے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شکمِ مبارک پر دو پتھر بندھے ہوتے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے وعدہ کیا تو تین دن تک اس شخص کا مقامِ مقررہ پر انتظار فرماتے رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غزوات میں شریک ہوتے تھے، میدانِ جنگ میں اُس مقام پر کھڑے ہوکر جہاد فرماتے جہاں جان کو سب سے زیادہ خطرات ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ میں سے سب سے بہادر اُس شخص کو سمجھا جاتا تھا جو میدانِ جنگ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے زیادہ قریب ہوتا تھا۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو سیرتِ طیبہ مسلمانوں کی بے عملی کے مرض، مسئلے اور چیلنج کا سب سے شاندار جواب ہے۔

غلامی اور مغربی مفکرین کے زیراثر مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے میں یہ احساس پیدا ہوا کہ اسلام اور سیرتِ طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو سال ”پرانی“ چیز ہیں، چنانچہ وہ جدید عہد میں ہمارے اس طرح کام نہیں آسکتے جس طرح چودہ سوسال پہلے کام آتے تھے۔ لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف باعثِ تخلیقِ کائنات اور سردارالانبیاء ہی نہیں ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین بھی ہیں اور ختمِ نبوت کے بہت سے مفاہیم میں سے

ایک مفہوم یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ بیک وقت قدیم بھی ہیں اور جدید بھی۔ اسلام اور علم دشمن طاقتیں الزام لگاتی ہیں کہ مسلمان قدامت پسند Orthodox ہیں۔ لیکن اسلام اور سیرتِ طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے قدامت پسند Orthodox ہونے کا مفہوم زیادہ حقیقی یا Original ہونا یا اصل کے زیادہ سے زیادہ قریب ہونا ہے۔ اور جو اصل کے جتنا زیادہ قریب ہے وہ خود کو دریافت کرنے یا Re-Invent کرنے کی اتنی ہی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ اتنا ہی جدید اور تخلیقی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کا مفہوم یہ ہے کہ قدیم ہونے کا مفہوم اسلام کی روح سے آگاہ ہونا ہے اور جدید ہونے کا مطلب اس روح کے اظہار کے لیے نئے نئے پیرائے، اسالیب، سانچے اور ڈھانچے بنانے کی اہلیت کا حامل ہونا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ختمِ نبوت کا عقیدہ ایک انقلابی عقیدہ ہے، اور یہ عقیدہ پوری امتِ مسلمہ کو قدیم اور جدید کے درمیان لاکھڑا کرتا ہے۔ اس مقام پر کھڑی ہوکر امتِ مسلمہ ماضی کی قوت سے مستقبل کشید کرتی ہے۔ غورکیا جائے تو سیرتِ طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف اس پہلو میں مسلمانوں کو درپیش کتنے ہی امراض کا علاج، کتنے ہی مسائل کا حل اور کتنے ہی چیلنجوں کا جواب ہے۔

سیرتِ طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کے تعلق کا ایک نفسیاتی پہلو یہ ہے کہ سیرتِ طیبہ مسلمانوں کو اتنی مثالی محسوس ہوتی ہے کہ اس کی پیروی دشوار بلکہ بسااوقات ناممکن محسوس ہوتی ہے۔ مسلمانوں کو لگتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو باعثِ تخلیقِ کائنات تھے، سردارالانبیاء تھے، اللہ کے حبیب تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہر عمل آسان تھا، لیکن ہم تو عام لوگ ہیں، ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی پیروی کہاں تک ہوسکتی ہے! تجزیہ کیا جائے تو یہ بے انتہا تعریف کے پردے میں عمل سے فرار کی ایک کوشش ہے۔ اس چیلنج کا جواب سیرتِ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ملتا ہے کہ بلاشبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم باعثِ تخلیق کائنات ہیں، بلاشبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سردارالانبیاء ہیں، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سب کچھ ہونے کے ساتھ ساتھ بشر بھی ہیں۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بنی نوع انسان کے لیے واجب الاتباع ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر نہ ہوتے تو واجب الاتباع کیسے ہوتے؟ یہاں کہنے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت مجرد نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بشر کی حیثیت سے دنیا کے کسی بھی انسان سے زیادہ مصائب برداشت کیے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے کسی بھی انسان سے زیادہ ستایا گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر دنیا کے کسی بھی انسان سے زیادہ آزمائشیں آئی ہیں۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کی انقلابی شان نمایاں ہوکر سامنے آتی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت امتِ مسلمہ کے بہت سے امراض کی دوا، بہت سے مسائل کا حل اور بہت سے چیلنجوں کا جواب بن جاتی ہے۔

ہمارے عہد کا ایک بڑا چیلنج یہ ہے کہ انسانوں نے طرح طرح کی مصنوعی فضیلتیں ایجاد کرکے انہیں پوری انسانیت کے لیے معیار بنادیا ہے۔ مثال کے طور پر مغرب نے ایک ہی دنیا میں تین دنیائیں تخلیق کر ڈالی ہیں۔ پہلی

ترقی یافتہ کہلاتی ہے، دوسری دنیا کو ترقی پذیر دنیا کا نام دیا گیا ہے، جب کہ تیسری دنیا کو پسماندہ یا غریب دنیا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان دنیائوں میں پہلی دنیا کی حیثیت ''جنت'' کی ہے، دوسری دنیا جنت کی طرف سفر سے عبارت ہے، اور تیسری دنیا زمین کا ''جہنم'' ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ان دنیائوں کا فرق صرف نظری نہیں، عملی بھی ہے۔ پہلی دنیا کے لوگ قابلِ احترام ہیں، اس لیے وہ احساسِ تفاخر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ دوسری دنیا کے لوگ پہلی دنیا کے لوگوں کی نقل کرنے والے ہیں اور تہذیب ان کے لیے ایک امکان کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر دوسری دنیا کے لوگ احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں۔ تیسری دنیا کے لوگوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ نہ قابلِ احترام ہیں، نہ مہذب اور نہ ہی اُن کے قابلِ احترام ہونے کا کوئی امکان ہے۔ چنانچہ یہ لوگ صرف احساسِ کمتری میں نہیں احساسِ جرم میں بھی مبتلا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان تمام امتیازات کی بنیاد اقتصادیات اور معاشیات ہے۔ لیکن یہ انسانوں کو ناپنے تولنے کا واحد مصنوعی معیار ہے۔ ایک معیار جمہوریت ہے۔ جو اقوام جمہوری ہیں انہیں تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اور جو اقوام جمہوری نہیں ہیں انہیں دنیا حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔

ANS 03

زکوٰۃ،تجارت،معیشت،سیاست کا بھی ذکر ہے۔یہ قابل فکر ہے ہمارے لئیے کہ کن حالات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمکو اس بات پر مجبور ہونا پڑا کہ ایک حکومت قائم فرمائیں،حکومت کی اقامت پر مجبور ہونے کا لفظ اس لئے استعمال کیا کہ موجودہ دور مینروشن خیال، سیکولر طبقہ اور جدید مفکرین اپنے نظریات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کررہے ہیں کہ اسلام کا سیاست،تجارت،حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

مگر حقیقت اس کے برعکس ہے کہ رسول اکرمصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مملکت قائم کرتے ہیناور اس مملکت کے حاکمِ اعلیٰ کی حیثیت سے حکمرانی بھی فرماتے ہیں،ہرچیز کا نظم و نسق رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قائم فرمایا اور ایسا کامیاب نظام چھوڑا کہ آپ کے بعد صدیوں تک چل رہا ہے اور حکمران رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمکے نظامِ سلطنت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔((1 معاشی حل:رسول کریمصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ میں تشریف لانے کے بعد سب سے پہلے مہاجرین کے معاشی مسائل کے حل کیلئے مواخات کا انتظام فرماتے ہیں۔اس نظام سے مہاجرین اور انصار کی معاشی حالات بہت بہتر ہو جاتی ہیں۔(2)دفاع: اس کے بعد محبوب کریمصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ شہر کی سیکورٹی اور دفاع کی طرف توجہ فرماتے ہیں کیونکہ مدینہ میں کوئی نظام سلطنت نہیں تھا،وہاں کے لوگوں کے درمیان جھگڑے،لڑائیاں چل رہیں تھی،رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہر کو محفوظ بنانے کیلئے ایک ہنگامی اجلاس طلب فرماتے ہیں۔اجلاس میں مسلم اور غیر مسلم کے قبائل کے بڑے سردار شریک ہوتے ہیں رسول کریم جب حکومت کے قیام کی تجویز پیش کرتے ہیں تو سب متفقہ طور پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمکو صدر منتخب کرلیتے ہیں۔

مملکت میں حکمران اور رعایا کے کیا حقوق ہو سکتے ہیں اس حوالے سے آپصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام قبائل سرداروں سے مشورہ کرکے ایک دستور مرتبہ کیا۔جس میں یہ لکھا تھا کہ مملکت ایک مستقل اور خودمختار ہوگی

اور غیرمسلموں کو ان کے دین کی پوری پوری آزاری ہوگی۔ایک دفعہ کے الفاظ یہ ہیں "للمسلمین دینھم و للیہود دینھم" یعنی مسلمانوں کیلئے مسلمانوں کا دین اور یہودیوں کیلئے ان کا دین ہے۔ اور دفاع کے سلسلے میں یہ فیصلہ ہوا اگر باہر سے کوئی دشمن حملہ کرے تو ہر قبیلہ براہ راست مدافعت کرے گا،لوگ ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور فوج میں جو اخراجات ہونگے ہر قبیلہ خود برداشت کرے گا،اس معاہدے کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں مرکزی حکومت کے پاس کوئی خزانہ نہیں تھا لہٰذا مجبوراً ہوکر یہ طریقہ اختیار کیاگیا کہ لوگ رضاکارانہ اور بغیر تنخواہ کے فوج میں شامل ہوں،فوج کا سارا نظام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تھا،مدینہ میں سیکورٹی اور دیگر انتظامات کرنے کے بعد رسول اکرم مدینہ کے جنوب مغربی اور ساحلی علاقوں کی طرف تشریف لے جاتے ہیں اور غیرمسلم قبائل کو نئی قائم ہونے والی ریاست سے فوجی تعاون پر آمادہ کرکے معاہدہ کرتے ہیں۔

یہ طے ہوا کہ تم پر کوئی حملہ کرے گاتو مسلمان تمہاری مدد کریں گے،اگر کسی نے مسلمانوں پر حملہ کیا تو تم مسلمانوں کی مدد کروگے،اور یہ بھی معاہدہ تھا کہ قبیلے والے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلماور مسلمانوں کے دشمنوں سے دوستی بھی نہیں کریں گے،بہرحال ان معاہدات سے مدینہ کے چاروں طرف دوستوں میں اضافہ اور مخالفوں،دشمنوں میں کمی آگئی۔(3) نظام تعلیم: تعلیمی نظام یہ تھا کہ مدینہ میں صفہ کے نام پر درسگاہ تھی،شہر کے باشندے پڑھ کر چلے جاتے اور دور دراز علاقوں کے رہنے والے وہیں قیام کرتے،مختلف لوگوں کو ضرورت کے پیش نظر مختلف علوم وفنون پر تعلیم اور تربیت دی گئی۔جو لوگ بالکل ان پڑھ تھے ان کو لکھنا پڑھنا سکھایا گیا،عہدنبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں مدینہ کے اندر 9مساجد تھی،ہر مسجد اپنے محلے کیلئے ایک درسگاہ کی حیثیت رکھتی تھی،بچے اور بالغ پڑھتے تھے۔

قباء میں ایک مسجد اور مدرسہ تھا وہاں وقتاً فوقتاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود تشریف لے جاتے اور ذاتی طور پر نگرانی فرماتے۔مدینہ میں اور مضافات کے علاقوں میں اساتذہ مقرر تھے،انہیں حکومت کی طرف سے تنخواہیں دی جاتی،بہترین تعلیمی نظام کا اندازہ ایک واقعہ سے کیجیئے کہ رسول اکرمصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سید نا معاذ بن جبل ؓکو یمن کیلئے انسپکٹر جنرل آف ایجوکیشن کے طورپر بھیجتے ہیں،حضرت معاذؓ وہاں جاکر تدریسی فرائض سرانجام دینے کے ساتھ تعلیمی ادارے بھی قائم کرتے ہیں، اسی طرح صوبوں اور شہروں میں بھی تعلیم کا ایسا انتظام کیاگیا۔(4) نظام عدل:عدلیہ کا قیام ریاست کی اہم ترین ذمّہ داریوں میں سے شمار ہوتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمنے اس کا بہترین انتظام فرمایا،مدینہ میں قاضی یعنی ججوں کو مقرر کیا۔کسی مسائل اور جھگڑے کے حل کیلئے لوگ وہاں تعینات ججوں کے پاس جاتے یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمکی طرف آتے،فی الفور مقدمہ درج کرکے فیصلہ سنایا جاتا،علاقوں اور شہروں کی فتوحات ہونے کے ساتھ عدالتی انتظامات میں اضافہ کیا جاتا۔

یمن کے علاقے نجران کے عیسائیوں کے وفد کی درخواست پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدنا عبیدہ بن جراح ؓکو ان کے ساتھ بھیجا،سیدنا عبیدہؓ نے وہاں اپنے فرائض بخوبی سرانجام دئیے کہ یمن میں تیزی سے پھیلنے لگا،بہت سے عیسائی متاثر ہو کر مسلمان ہوگئے۔(5)گورنرزکاتقرر: صوبوں کا نظام کنٹرول کرنے کیلئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گورنر مقرر کئے،جن کی سرگرمیوں اور کارکردگی کے حوالے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمنے خود نگرانی فرمائی(6).سفارتی نظام: ریاست مدینہ میں سفارتی نظام بھی تھا،رسول کریمصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیرونی ممالک کے بادشاہوں کو اسلام کی دعوت دینے کیلئے ان کے پاس اپنے سفیروں کو بھیجتے،یہاں یہ بات بھی ذھن نشیں کرلیجئے کہ ان سفیروں میں بعض مرتبہ غیر مسلم بہت سفیر بنے،وزارت خارجہ کا عہدہ حضرت سیدنا عمر فاروق ؓکے پاس تھا،بعض روایات میں ہے کہ حضرت سیدنا ابو بکر صدیقؓ وزارت داخلہ کے منصب پر فائز تھے،اندرونی معاملہ کو حل کرتے۔

(7) مالیاتی نظام:اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ریاست مدینہ کے مختلف انتظامات کیساتھ مالیات کا بھی شعبہ قائم فرمایا،کیونکہ آمدنی کے مختلف ذرائع تھے مثلاً زکوۃ،صدقات،مال غنیمت،مال فئی،غیر مسلموں سے جزیہ،خراج وغیرہ،حکومتی آمدنی کے نگران حضرت سیدنا بلالؓ تھے،ذرائع آمدنی میں سے ایک یہ بھی تھی کہ صاحب نصاب یعنی مالدار لوگ اپنی رقم حکومتی خزانے میں جمع کراتے،اگر کوئی کاشتکار ہوتا تو وہ پیداوار کا ایک حصہ ادا کرتا،تاجر بھی اپنے سرمایہ تجارت پر رقم دیتا،کسی کے پاس لوہے سونے یا اس زمانے میں کسی اور چیز کی کانیں ہوتیں تو وہ لوگ اس کی ایک مقدار حکومت کے خزانے میں جمع کرواتے۔اسی طرح شہر مدینہ سے باہر سلطنت میں شامل شہروں اور علاقوں کے لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرنے کیلئے تحصیلدار بھیجے جاتے تھے۔چند ماہ بعد آپصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقامی محصل مقرر کئے۔

(8)کلرکوں،کاتبوں کاتقرر:سلطنت کے اہم ترین انتظامات سنبھالنے کیلئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دفتری نظام (سیکرٹریٹ)کا شعبہ قائم فرمایا۔ان عہدوں پر تعینات لوگ حساب،کتاب اور لکھنا خوب جانتے تھے۔ان میں سے کچھ لوگ نازل ہونے والی وحی تحریری شکل میں لکھا کرتے،رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پھر بعض لوگ قبائل کے سرداروں اور حکمرانوں کو خطوط لکھا کرتے تھے۔اور کچھ لوگ زکوٰۃ کا اندراج کرتے یعنی رقم کس سے وصول ہوئی،کس پر خرچ کی گئی،اسی طرح جنگوں سے جو مال غنیمت حاصل ہوتا تو اس کے بارے میں تمام تفصیلات لکھ دی جاتیں۔عہد نبوی ِ میں ریاست مدینہ کا رقبہ تاریخی شواہد کے اعتبار سے تین ملین یعنی 30لاکھ مربع کلومیٹر پر مشتمل تھا۔

اس وسیع سلطنت میں فلسطین وعراق کے جنوبی علاقے کے حصے بھی شامل تھے۔جیسے جیسے ریاست مدینہ میں وسعت آتی گئی ضرورت کے موافق سلطنت میں ہراک کا انتظام کیا جاتا تھا اور بعد کے زمانے میں جو ترقی یافتہ انتظامی ادارے نظر آتے ہیں ان سب کی بنیاد عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پڑچکی تھی۔

ANS 04

جب کسی جج کے پاس کوئی مقدمہ پیش ہو تو وہ پہلے یہ دیکھتا ہے کہ آیا کسی نافذ شدہ قانون کی بنا پر مقدمے کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ اگر کسی قانون کا اطلاق ہوتا ہو۔ تو وہ قانون پر فیصلہ کر دیتا ہے۔ لیکن اگر قانون اس مقدمے کا فیصلہ کرنے کے لئے کافی نہ ہو تو پھر جج انصاف کے اصول تلاش کرتا ہے یعنی قانون میں جو خلا ہو اس کو انصاف سے پُر کرتا ہے۔ اور کسی انصاف کے اصول کی بنا پر فیصلہ کر دیتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کے پاس جب کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو حضور ﷺ پہلے یہی دیکھتے کہ آیا قرآن کے کسی حکم سے مقدمہ کا فیصلہ ہو سکتا ہے اگر ہو سکتا تو حضور ﷺ قرآن کی بنا پر فیصلہ کرتے۔ اگرچہ ایسا بھی ہوتا کہ آپ ﷺ اپنے حکم کے ذریعے قرآن کے احکام کی تشریح یا تاویل کر دیتے۔ لیکن اگر اس معاملہ کے متعلق قرآن کی کوئی نصّ موجود نہ ہوتی تو حضور ﷺ خود اس پر حکم صادر فرماتے کیونکہ حضور ﷺ خود شارع تھے۔ یا جو کچھ حضور ﷺ کی رائے میں انصاف ہوتا، اس کے مطابق فیصلہ کرتے۔ چنانچہ جو تشریح یا تاویل حضور ﷺ نے نصِّ قرآن کی کی، یا جو حکم حضور ﷺ نے خود صادر فرمایا۔ یا جس انصاف کے اصول کو حضور ﷺ نے نافذ کر دیا، وہ ہمارے لئے قانون ہے۔ اسی طرح بجائے کسی مقدمے کے اگر کوئی معاملہ حضور ﷺ کے روبرو پیش ہوا جس میں احکام جاری کرنے کی ضرورت تھی۔ تو جیسی صورت مقدمہ کے فیصلہ کی تھی، ایسی ہی صورت اس معاملہ کے فیصلہ کی بھی ہوئی اور اسی طرح حضور ﷺ کی تشریح، (تاویل) احکام یا نافذ کردہ اصول ہمارے لئے قانون بن گئے۔ یہ ضروری نہیں کہ حضور ﷺ نے واضح الفاظ میں کوئی قانون نافذ کیا ہو۔ حضور ﷺ کے عمل سے جو لازمی نتیجہ پیدا ہوا ہو وہ بھی قانون ہے۔

ظاہر ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کی قانون سازی کا موضوع بہت وسیع ہے۔ چند صفحات میں تو یہی ہو سکتا ہے کہ اس میں کے کچھ حصوں پر تبصرہ کر دیا جائے۔ حصوں کا انتخاب میں اس نقطۂ نگاہ سے کروں گا کہ موجودہ حالات میں کس قانون کی طرف توجہ مبذول کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔

1. سب سے پہلے میں اُن مشہور ہدایات کا ذِکر کروں گا جو رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو دی تھیں۔ جب ان کو یمن کا حاکم مقرر کیا تھا۔ حضور ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ سے دریافت کیا کہ "کوئی معاملہ پیش ہو گا تو کیسے فیصلہ کرو گے۔" حضرت معاذ بن جبلؓ نے جواب دیا۔ "کتاب اللہ کے مطابق۔" حضور ﷺ نے سوال کیا "اگر کتاب اللہ میں کوئی حکم موجود نہ ہو؟" حضرت معاذ بن جبلؓ نے کہا "تو سنتِ رسول اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔" سوال ہوا "اور اگر اس میں بھی کوئی حکم موجود نہ ہو۔" جواب تھا "تو میں اجتہاد کروں گا۔" حضور ﷺ نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے۔ اور فرمایا، تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں، جس نے اللہ کے رسول ﷺ کے قاصد کو ہدایت دی۔"

اس حدیث کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ اجتہاد کی بنیاد ہے۔ لیکن یہ صرف اجتہاد کی بنیاد ہی نہیں اس میں مسلمان اولی الامر کے متعلق مفصل ہدایت موجود ہے۔ اس حدیث کی رُو سے فیصلہ کیا جائے گا کہ کیا والئ امر اسلام پر قائم رہا؟ اس نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی یا نہیں؟ اس کا حکم شریعت کے مطابق ہے یا شریعت کے خلاف۔

میری رائے میں اس حدیث سے مندرجہ ذیل نتائج پیدا ہوئے:

الف کہ والیٔ امر کی نیت کیا ہونی چاہئے۔ جس وقت وہ کوئی حکم صادر کرے۔ یہ لازم ہے کہ اس کی نیت یہ ہو کہ وہ قرآن کا پابند ہے اور پہلے قرآن و سنت سے تلاش کرے کہ اس قضیہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا کیا حکم ہے اور اگر اس کو قرآن و سنت میں صاف حکم نہ ملے۔ تو وہ کوشش کرے کہ قرآن و سنت کی روشنی میں صراطِ مستقیم دریافت کرے۔ والیٔ امر کے لئے لازم ہے کہ ایسی ہی اس کی نیت ہو۔ کیونکہ اعمال کا خیر و شر نیت سے متعین ہوتا ہے۔ اگر اولی الامر کا ارادہ ہی نہ ہو کہ قرآن و سنت کی پابندی کرے تو اگرچہ محض اتفاق سے اس کا عمل قرآن و سنت کے مطابق ہو جائے تاہم اس کی نافرمانی تو باقی ہی رہے گی۔ جب اللہ کی اطاعت کا ارادہ نہ ہو تو محض اس وجہ سے کوئی عمل درست نہیں ہو پاتا کہ نفسانی خواہشات کی بنا پر جو عمل کیا جا رہا ہے فی الواقع وہی ہے جس کا اللہ نے بھی حکم دیا ہے۔ جس عمل کا محرک اللہ کی اطاعت نہیں بلکہ نفسِ امارّہ ہے، وہ جہاں تک عذاب و ثواب کا تعلق ہے، درست عمل نہیں ہے۔ اگر آپ خیرات کریں اور نیت صاف اس سے کسی انسان کو راضی کر کے اس سے مالی فائدہ اُٹھانے کی ہو۔ تو خیرات، خیرات نہ رہے گی۔

ب یہ کہ عمل کا قرآنِ پاک کے مطابق ہونا لازم ہے۔ اور جہاں ایک نتیجہ اس کا یہ ہے کہ قرآن کے مخصوص احکام کی پابندی ہو گی دوسرا نتیجہ یہ بھی ہے کہ اس کے عام احکام کی پابندی بھی لازم ہو گی۔ قرآن پاک بار بار معروف کا حکم دیتا ہے۔ اولی الامر کو خاص طور پر ہدایت کرتا ہے کہ وہ معروف کا حکم دیں۔ (الَّذينَ إِن مَكَّنّـٰهُم فِى الأَرضِ أَقامُوا الصَّلوٰةَ وَءاتَوُا الزَّكوٰةَ وَأَمَروا بِالمَعروفِ وَنَهَوا عَنِ المُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عـٰقِبَةُ الأُمورِ (٤١)... سورة الحج" لہٰذا والیٔ امر خود بھی معروف کا پابند ہو گیا۔ اور اس امر کا بھی پابند ہوا کہ دوسروں کو معروف کا حکم دے۔ یعنی ایک محکمہ بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے قائم کرے۔ معروف وہ عمل ہے جس کو اسلامی ذہن رکھنے والا معاشرہ قبول کرے یعنی وہ عمل جو جمہور مسلمانوں کی رائے میں صحیح ہو جب کہ وہ اس عمل کے متعلق کوئی ذاتی خواہش نہیں رکھتے اور نہ ہی ان کے ذاتی مفاد اس سے وابستہ ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے بھی فرمایا ہے "جسے مسلمان اچھا سمجھیں اللہ کے نزدیک وہی اچھا ہے۔" سو والیٔ امر معروف کا پابند ہو گا اور اس کا کوئی عمل جو معروف کے خلاف ہو، جائز نہ ہو گا اور لوگوں پر اس کے حکم کی پابندی لازم نہ ہو گی۔ کیونکہ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے «لَا طَاعَةَ لمخلوق في معصية الخالق» البتہ مسلمان اس کو بہانہ نافرمانی کا نہیں بنا سکتے۔ معروف ایسا عمل ہے جس کے متعلق کوئی شک و شبہ نہیں ہوتا اور کسی بحث کی اس میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ سوائے اس کے کہ کوئی انسان غلط نیت سے خواہ مخواہ ایک تنازعہ پیدا کرے۔

ج جہاں والیٔ امر سنت کا پابند ہوگا۔ وہاں اجماع بھی پابند ہو گا۔ کیونکہ رسولِ اکرم ﷺ کے ارشاد کے بموجب اجماع صحیح ہے۔ اور لہٰذا قابلِ پابندی۔

د والیٔ امر کا صاحب اجتہاد ہونا بھی لازم ہے۔ اگر وہ اجتہاد کی قابلیت نہیں رکھتا تو اللہ و رسول کا منشا تو پورا نہ ہوا۔

2. تنازعات کے فیصلے کے متعلق حضور ﷺ نے حکم دیا کہ جب تک دونوں فریقوں کو سن نہ لیا جائے۔ فیصلہ ادر نہ کیا جائے۔ یہ حکم حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو دیا تھا۔ جب ان کو یمن کا عامل بنا کر بھیجا۔ ایک اور موقع پر حضور ﷺ نے حکم دیا کہ مدعی اور مدعا علیہ حاکم کے سامنے بیٹھیں۔ اس حکم کا نتیجہ بھی یہی ہے کہ دونوں سے برابری کا سلوک ہو اور دونوں کو سنا جائے۔

یہ اصول کہ کسی کے خلاف فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک اس کو سن نہ لیا جائے، اُن اصولوں میں سے ہے، جن کو فی زمانہ قدرتی انصاف کے اصول کہا جاتا ہے۔ یہ اصول آپ کو پاکستان، ہندوستان، انگلستان کے فیصلہ میں ملے گا۔ اور عام طور پر تمام مہذب ممالک کے قوانین میں ہو گا۔ البتہ اشتراکی ملکوں کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ پاکستان کی موجودہ حکومت نے بہت سے سرکاری ملازموں کو بغیر نوٹس اظہارِ وجوہ موقوف کر دیا تو ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ کے ریٹائر ججوں نے ایک قرار داد منظور کر کے حکومت کو بھیجی تھی جس میں لکھا گیا تھا کہ اسلامی انصاف کے اصولوں کے مطابق ان ملازمین کا حق ہے کہ ا ن کو موقع صفائی کا مہیا کیا جائے۔ اسلامی انصاف کا جب ذکر ججوں نے کیا تو ان کا اشارہ رسول اکرم ﷺ کی مندرجہ بالا حدیثوں کی جانب تھا۔ لیکن حکومت کے ایک وزیر نے بیان دیا کہ یہ اصول کہ ملزم کو صفائی کا موقع ملنا چاہئے ایک بورژوائی اصول ہے۔ اسی بیان کی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ ممکن ہے اشتراکی ممالک اس اسلامی اصول کو قبول نہ کرتے ہوں۔

3. دوسرا اصول جو رسولِ اکرم ﷺ نے تنازعات کے فیصلہ کے متعلق قائم کیا وہ یہ تھا کہ تنازعہ کا فیصلہ ریکارڈ پر ہوتا ہے۔ یعنی اس مواد کی بنا پر ہوتا ہے۔ جو مواد حاکم یا قاضی کے سامنے بطور حاکم یا قاضی آئے۔ ادھر ادھر کی باتیں سن کر یا کسی ایسی شہادت سے متاثر ہو کر، جو حاکم کے سامنے بطور حاکم نہیں آئی، فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اصول بھی مہذب اقوام نے قبول کر لیا ہوا ہے (سوائے کمیونسٹ ممالک کے) اور یہ مسلمہ ہے۔ اس کی دو بنیادیں ہیں۔ اول یہ کہ قانونِ شہادت کی اقسام معین کر دیتا ہے اور ان اقسام کے علاوہ مواد کو قبول نہیں کرتا۔ دوسرے یہ کہ جو مواد حاکم کے پاس بطورِ حاکم پیش نہیں ہوا، اس کی تردید کا موقع فریقِ مخالف کو نہیں ملتا۔ اور یہ ناجائز ہے کہ تردید کا موقع فریقِ مخالف کو نہیں ملا۔ اور یہ ناجائز ہے کہ تردید کا موقع مہیا کیے بغیر کسی کے خلاف کوئی شہادت قبول کر لی جائے۔

یہاں رسولِ اکرم ﷺ کے اس فرمان کا ذکر کر دینا بھی مناسب ہو گا کہ اگر کسی نے غلط فیصلہ کرا لیا۔ تو اس نے صرف آگ کا ٹکڑا خریدا۔ جو چیز ایک فریق کے لئے حرام تھی، فیصلہ کے ذریعے حلال نہ ہو جائے گی۔ فیصلہ تو محدود مواد پر ہوتا ہے اور اس بحث پر ہوتا ہے جو حاکم کے سامنے کی جائے۔ اور یہ ہو سکتا ہے کہ جو فریق حق پر نہیں وہ اس وجہ سے مقدمہ جیت جائے کہ اس نے مواد بہتر پہنچایا یا اس کی بحث زیادہ اثر پیدا کرنے والی تھی۔

4. انسانی برابری کا عملی نمونہ اسلام نے دنیا کے روبرو پیش کیا۔ اسلام سے پہلے یورپ انسای برابری کا قائل ہی نہ تھا۔ یونانی تہذیب نے انسانوں کو چار طبقات میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ اور رومن تہذیب نے تین طبقات میں۔ یہ دونوں

تہذیبیں غلاموں کو شیروں کے آگے ڈالتی تھیں۔ عیسائیت نے بھی غلاموں کو قانوناً جائز تسلیم کیا۔ اور غلاموں کو ہدایات دیں کہ وہ اپنے مالکوں کی پوری اطاعت کریں۔ غلامی کا جواز یہ بتایا کہ انسان چونکہ گنہگار ہو گیا تھا اس لئے اس کو گناہ کی سزا مل رہی ہے۔ اسلام نے آکر انسانوں کو یکسر برابر کر دیا۔ برابری انصاف کا سب سے بڑا اصول ہے اور سچ یوں کہ انصاف کی عمارت کی بنیاد برابری ہی ہے۔ حضور ﷺ نے مسلمانوں کو قصاص اور دِیت میں بھی برابر کر دیا۔ قرآن پاک نے فرمایا کہ وجہِ تکریم تقویٰ ہے۔ نسل و رنگ وغیرہ کی بنا پر کوئی فوقیت کسی کو حاصل نہیں اور یہی حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا۔ اسلام نے انسانوں کو حقوق میں برابر کر دیا، اس کے متعلق حضور ﷺ کا ایک مسلسل طرزِ عمل ہے۔ جب غزوۂ خندق کے موقع پر مسلمان خندق کھود رہے تھے تو حضور ﷺ خود اپنے سر پر ٹوکری اٹھاتے تھے۔ جب مسلمانوں نے اعتراض کیا تو فرمایا: "کیا میں تمہارا بادشاہ بن کر بیکار رہوں؟" ایک دفعہ حضور ﷺ مسلمانوں کی ایک قطار ٹھیک کر رہے تھے۔ چھڑی حضور ﷺ کے ہاتھ میں تھی، ایک مسلمان کی پیٹھ پر لگ گئی۔ اس نے کہا حضور ﷺ میں قصاص لوں گا۔ حضور ﷺ نے پیٹھ کو ننگا کیا اور فرمایا لے لو۔ اس نے بڑھ کر مہرِ نبوت چوم لی، لیکن حضور ﷺ نے تو پیٹھ پیش کر ہی دی تھی۔ اس سلسلے میں سب سے اہم رسولِ اکرم ﷺ کا چوری کے ایک مقدمہ کے متعلق ردِ عمل ہے۔ ایک اونچے گھرانے کی عورت نے چوری کی۔ جو لوگ اس کو حد سے بچانا چاہتے تھے انہوں نے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو سفارشی بنا کر حضور ﷺ کے پاس بھیجا۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ اسامہؓ تو اللہ کی حدود میں سفارش کرتا ہے؟ اس پر حضرت اسامہؓ نے فوراً کہا "یا رسول اللہ مجھے معاف فرمائیے مجھ سے خطا ہوئی۔" پھر حضور نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا۔ "لوگو تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہوئے کہ جب ان میں سے کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تو اس سے درگزر کرتے۔ اور جب کوئی کمزور آدمی ایسے فعل کا مرتکب ہوتا۔ تو اس کو سزا دیتے۔ قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ اگر فاطمہؓ بنت محمد ﷺ پر بھی یہ جرم وارد ہوتا تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ ڈالتا۔

برابری کی جو مثال حضور ﷺ نے قائم کی، اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اگر خدانخواستہ فی الواقع حضرت فاطمہؓ کسی چوری کی مرتکب ہوتیں۔ تو ساری امت کہتی کہ ان کو ایسی سزا نہ دی جائے بلکہ امت کے کسی فرد کی جرأت ہی نہ ہوتی کہ ایسی سزا کا ذکر کرے۔ لیکن حضور ﷺ جو کچھ فرما رہے تھے اس میں کوئی مبالغہ نہ تھا۔ اور حضور ﷺ وہی کرتے جو حضور ﷺ نے زبانِ مبارک سے فرمایا۔ یہ درست ہے کہ ایسا واقع ہونے کا کوئی احتمال نہ تھا لیکن حضور ﷺ نے ایک مثال بیان کر کے انسانوں کی قطعی برابری پر مہر ثبت کر دی۔ اسی طرزِ عمل کا نتیجہ وہ برابری تھ جس کا ہم نے بعد میں مشاہدہ کیا۔ ہمارے خلیفہ یا بادشاہ نے کبھی قاضی کے سامنے پیش ہونے پر اعتراض نہیں کیا۔ حضرت عمرؓ پیش ہوئے، حضرت علیؓ پیش ہوئے۔ خلیفہ مامون الرشید، سلطان مراد، محمد بن تغلق وغیرہ پیش ہوتے رہے۔ جہاں تک امیر کے سزا سے بچنے کا تعلق ہے، حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے کو بھی سزا دی حالانکہ یہ سزا مصر میں بھی، ان کو دی جا چکی تھی صرف وہ سزا لوگوں کے سامنے نہ دی گئی

تھی۔ اس لئے حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق شریعت کا منشا پورا نہ ہوا تھا۔ اسی سزا کے نتیجہ میں حضرت عمرؓ کا بیٹا جاں بحق ہو گیا۔ اسی طرح حضرت عمرو بن العاصؓ کے بیٹے کو بھی مصر سے بلوایا جب ان کو معلوم ہوا کہ ان کو سزا نہیں دی گئی۔ حضرت عمرو بن العاصؓ کے بیٹے نے ایک قبطی کو مارا تھا۔ حضرت عمرؓ نے قبطی کو بلایا اور اپنے سامنے حضرت عمرو بن العاصؓ کے بیٹے کو اس سے مروایا۔ اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے تھے۔ "مار بڑوں کی اولاد کو۔"

ہمارے موجودہ آئین کے مطابق صدر اور گورنر کسی عدالت کے سامنے پیش نہیں ہو سکتے۔ چاہے وہ جتنے انسانوں کو چاہیں قتل کر دیں۔ جس قدر روپیہ چاہیں غبن کر لیں۔ غرض کہ چاہے کیسا بھی جرم کریں۔ جب تک وہ صدر یا گورنر ہیں۔ ان سے کوئی باز پرس نہیں ہو سکتی۔ یہ ملحدانہ تصورات کا اثر ہے۔ ورنہ کہاں اسلام اور کہاں اس قسم کے امتیازات حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ، خلیفہ مامون الرشید، سلطان مراد سب عدالت میں پیش ہو سکتے ہیں لیکن پاکستان کے گورنر اور صدر نہیں ہو سکتے۔ حضرت عمرؓ کا محاسبہ تو قوم اتنے جرم پر بھی کر سکتی ہے کہ ان کی قمیص دوسروں سے تھوڑی سی لمبی تھی۔ اور خود حضرت عمرؓ نے جب سوال کیا کہ اگر میں نے فی الواقع قمیص کا کپڑا زیادہ لے لیا ہوتا تو تم کیا کرتے تو اس کا ان کو جواب ملا کہ یہ تلوار ہے اس سے تیرا سر قلم کرتے۔ اور حضرت عمرؓ نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ اگر وہ غلطی کریں تو ان کو قتل کرنے والے موجود ہیں۔ لیکن جہاں وہ اپنی قمیص کی لمبائی کے بھی جوابدہ تھے، ہمارے حاکم قتل کے بھی جوابدہ نہیں۔ اس موقع پر حضرت معاذ بن جبلؓ کی صلح کی گفتگو بھی یاد آگئی ہے، جو انہوں نے رومیوں سے کی تھی۔ رومیوں نے کہا ہمارا بادشاہ بڑی طاقت والا، بڑی شان و شوکت والا ہے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ نے جواب دیا۔ تمہارا بادشاہ ایسا ہو گا۔ ہمارا بادشاہ ہم میں سے ایک ہے اگر وہ چوری کرے ہم اس کا ہاتھ کاٹ دیں۔ اگر وہ زنا کرے تو ہم اس کو سنگسار کر دیں۔ اور جب ہم اس کے پاس کسی کام کے لئے جاتے ہیں تو اس کا فرض ہے کہ ہماری سنے ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ عدالت کے روبرو پیش ہونے سے ہماری عزت کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھتی ہے، اگر حضرت عمرؓ وغیرہ قاضی کے روبرو پیش ہوئے تو کیا ان کی عزت کم ہوئی۔ یا تاریخ میں انہوں نے اپنا مقام پیدا نہیں کیا؟ آج ہمیں اس امر کا احساس نہیں کہ ہم اس قسم کا قانون وضع کر کے اسلام پر دھبّہ لگا رہے ہیں۔ اس ملک کا بیان کردہ مذہب اسلام ہے تو کیا اسلام اس قسم کا امتیاز روا رکھتا ہے؟ آئین سے تو یہی نتیجہ نکلے گا کہ روا رکھتا ہے۔

5حجۃ الوداع کے موقع پر رسولِ اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو ان کے حقوق کا پرواہ عطا فرمایا۔ حکم دیا کہ سب کی جان و مال، عزت اسی طرح حرام ہے جیسے اس ماہ کی حرمت، جس میں حج ہو رہا تھا۔ اس حکم کا نتیجہ ہے کہ کوئی فرد یا گروہ یا حکومت کسی مسلمان کی جان، مال یا عزت پر حملہ نہیں کر سکتے۔ اقوامِ متحدہ نے تو ۱۹۴۸ء میں انسانی حقوق کا اعلان کیا ہے اور رسول اکرم ﷺ نے آج سے چودہ سو سال پہلے انسانی حقوق کا اعلان کر دیا تھا۔ یہ اعلان فرد کے حقوق کو قبول کرتا ہے۔ اور حکومت کے اختیارات پر حد قائم کرتا ہے۔ اس معاملہ میں اسلام اور اشتراکیت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اشتراکیت سرے سے انسان کا کوئی حق تسلیم ہی نہیں کرتی وہ تمام

حقوق حکومت کو دیتی ہے۔ جس کا اختیار ہے کہ جس فرد کی چاہے جان لے لے اور جس فرد کا چاہے مال لے لے۔ اشتراکی ممالکت کی مقننہ کے قانون سازی کے اختیارات انسانی حقوق سے محدود نہیں ہوتے اور وہ جیسا چاہے قانون وضع کر سکتی ہے۔ اس کے خلاف جمہوری ممالک میں مقننہ کے اختیارات محدود ہیں۔ وہ مال لیں تو معاوضہ ادا کریں گی۔ وہ کسی کی جان نہیں لے سکتے سوائے اس کے کہ ایک قانون ہے جس کے ما تحت سوائے مستثنیات کے افراد معاشرہ فوجی خدمت پر مجبور ہوتے ہیں۔

ANS 05

اسلام ایک مسلمان کو اور کسی اسلامی مملکت کے ایک شہری کو سوسائٹی کے اجتماعی معاملات میں حصہ لینے اور سوسائٹی کی بہتری کے لیے کردار ادا کرنے کا نہ صرف حق دیتا ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ قرآن کریم میں 'تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان' کے تحت جو ہدایت دی گئی ہے، وہ اس کی واضح علامت ہے، اس لیے کہ بر وتقویٰ اور اثم وعدوان کا اطلاق صرف ذاتی نیکی اوربدی پر نہیں ہوتا بلکہ سوسائٹی کا اجتماعی خیر وشر اور نفع وضرر بھی اس کے دائرے میں شامل ہے۔

دنیا کے مختلف ممالک سے جو مسلمان نقل مکانی کر کے مغربی ممالک میں گئے ہیں اور انھوں نے ان ممالک کو اپنا وطن بنا لیا ہے تو جہاں وہ ان ممالک کے وسائل اور سہولتوں سے استفادہ کر رہے ہیں، وہاں اس سوسائٹی کا بھی ان پر حق ہے کہ وہ اسے کچھ دیں۔ اس ملک اور سوسائٹی نے مسلمانوں کو بہت کچھ دیا ہے اور وہ اسے بھرپور طریقے سے وصول کر رہے ہیں، لیکن صرف لینا اور لیتے ہی چلے جانا انصاف کی بات نہیں ہے اور اس سوسائٹی کو کچھ دینا بھی ان کی ذمہ داری ہے۔

اس سلسلے میں احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے پاس انھیں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ ہمارے پاس بہت کچھ ہے اور ہم انھیں بہت کچھ دے سکتے ہیں۔ اس سوسائٹی کے پاس دنیا کے وسائل اور سہولتوں کی فراوانی ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے اور یہ ہمیں ان سے بہرہ ور کر رہے ہیں، لیکن ان کے پاس روح کا سکون اور آخرت کی نجات کا سامان نہیں جو بحمد اللہ تعالیٰ تمام تر خرابیوں کے باوجود ہمارے پاس موجود ہے، وہ ہم انھیں دے سکتے ہیں اور یہ ہماری دینی ذمہ داری بھی ہے کہ ہم وہ انھیں مہیا کریں۔ میں نے چند سال قبل نوٹنگھم برطانیہ میں ایک بڑے پادری صاحب سے اس سلسلے میں بات کی اور ان سے پوچھا کہ مغربی سوسائٹی میں خاندانی سسٹم کی بربادی اور روحانی سکون کے فقدان کے حوالے سے جو صورت حال ہے، کیا وہ اس سے مطمئن ہیں؟ انھوں نے نفی میں سر ہلایا اور کہا کہ یہ صورت حال ہمارے لیے بڑی پریشان کن ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ آپ کے نزدیک اس کا حل کیا ہے؟ تو انھوں نے بڑے صاف انداز میں یہ بات کہہ دی کہ ''ہمارے پاس اس کا کوئی حل نہیں ہے، ہم تو آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں'' ۔

جمہوریت کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ:

- حکومت کی تشکیل عوام کی رائے اور مشورہ سے ہوگی، جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا جانشین نامزد کرنے کی بجائے اس کا انتخاب لوگوں کی اجتماعی صواب دید پر چھوڑ دیا تھا۔
- حکومت خاندانی نہیں ہوگی، جیسا کہ صحابہ کرامؓ کے دور میں بننے والے خلفا حضر ت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کا نسبی وارث نہیں تھا۔
- حکومت عوام کے سامنے جواب دہ ہوگی، جیسا کہ حضرت ابوبکر نے اپنے پہلے خطبے میں عام لوگوں کا یہ حق تسلیم کیا کہ ''میں سیدھا چلوں تو میرا ساتھ دو اور اگر ٹیڑھا چلوں تو مجھے سیدھا کر دو۔'' یا جیسا کہ صحابہ کرامؓ کے دور میں اور بعد میں بھی عام لوگ خلفا کے طرز عمل پر کھلے بندوں انہیں ٹوک دیا کرتے تھے اور خلفا کو بعض اوقات اپنے فیصلے واپس بھی لینا پڑتے تھے۔
- حکمران اپنے معاملات عوام کے مشورہ سے چلائیں گے۔ عوامی معاملات عام لوگوں کے مشورہ سے اور علمی و فنی معاملات اہل علم و فن کی مشاورت سے چلانے کے بارے میں خلفاے راشدینؓ کے طرز عمل کا ذکر تاریخ کی بہت سی روایات میں موجود ہے، بلکہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسے امور میں جن میں وحی نازل نہیں ہوتی تھی، عام لوگوں یا متعلقہ لوگوں سے مشاورت کیا کرتے تھے، حتیٰ کہ اپنی رائے کے خلاف عمومی مشاورت کی رائے بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمائی ہے، جیسا کہ غزوۂ احد کے موقع پر ہوا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں رہ کر حملہ آور لشکر کا مقابلہ کیا جائے، لیکن نوجوان صحابہ کے اصرار پر آپ نے مدینے سے باہر نکل کر جنگ کرنے کا فیصلہ فرمایا۔
- ایک اسلامی ریاست میں قرآن وسنت کی بالادستی کو تسلیم کرنا اور ان کے واضح احکام کی پابندی حکمرانوں اور رعیت، دونوں کے لیے ضروری ہے اور ان میں سے کوئی بھی قرآن وسنت کے صریح احکام سے انحراف کا مجاز نہیں ہے، نیز قرآن وسنت کے صریح احکام کو بطور قانون نافذ کرنا مسلمان حکمرانوں کی منصبی ذمہ داری ہے، جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبے میں فرمایا تھا کہ ''اپنے حکمران کی اطاعت کرو، اگرچہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو، جب تک کہ وہ تم میں کتاب اللہ کے احکام کو نافذ کرے''، اور خلیفہ اول سیدنا ابوبکرؓ نے اپنے پہلے خطبے میں اعلان کیا تھا کہ ''میری اطاعت تم پر واجب ہے، جب تک میں قرآن وسنت کی پابندی کروں اور اگر اس سے انحراف کروں تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں ہے۔''
- اسلام ہر شخص کا یہ حق تسلیم کرتا ہے کہ وہ جس بات کو قانون کے حوالے سے غلط اور باہمی حقوق کے حوالے سے زیادتی سمجھتا ہو، اس کے خلاف آواز اٹھائے بلکہ سوسائٹی کے اجتماعی نقصان کی صورت میں یہ آواز اٹھانا اور معروف ذرائع سے اس کے سدباب کی عملی کوشش کرنا اس کے مذہبی فرائض میں

شامل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سوسائٹی میں خیر کے فروغ اور شر کے سدباب کے لیے محنت کرنا بھی ہر شخص کا حق بلکہ اس کی ذمہ داری ہے۔

- ایک اسلامی ریاست میں قرآن وسنت کی خلاف ورزی اور غیر مسلم ریاست میں مسلمہ دستور ومعاہدات کی خلاف ورزی پر ایسا کرنے والوں کو ٹوکا جا سکتا ہے اور جہاں حق تلفی ہو رہی ہو اس کی نشان دہی کی جا سکتی ہے، اور اس روک ٹوک، نشان دہی اور احتجاج کے لیے وہ سب ذرائع اختیار کیے جا سکتے ہیں جو اس دور اور علاقے میں معروف اور تسلیم شدہ ہوں۔ حضرت معاویہؓ رومیوں کے ساتھ جنگ بندی کے معاہدے کی مدت ختم ہونے سے پہلے اپنا لشکر لے کر روم کی سرحد کی طرف جا رہے تھے اور ان کا ارادہ تھا کہ وہ مدت ختم ہونے تک سرحد تک پہنچ جائیں گے اور مدت ختم ہوتے ہی حملہ کر دیں گے، لیکن حضرت عمرو بن عبسہؓ نے انھیں روک دیا اور کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کی رو سے اگر کسی قوم کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ ہو تو جنگ بندی کی میعاد ختم ہونے سے پہلے اس کے خلاف فوجوں کو حرکت میں لانا درست نہیں۔ حضرت معاویہؓ یہ سن کر راستے سے ہی واپس آ گئے اور فوج کو چھاؤنی میں بھیج دیا۔ اس طرح کے درجنوں واقعات خلفاے اسلام کے مختلف ادوارمیں ملتے ہیں۔

جمہوری ڈھانچے میں انصاف کے حوالے سے اسلام کا تصور حالات او رزمینی حقائق کی روشنی میں مختلف دائروں میں تقسیم ہے:

- جہاں مسلم اکثریت یا مسلم اقتدار ہے، وہاں اسلامی عدالتوں کا قیام ضروری ہے جو قرآن وسنت کے مطابق لوگوں کو انصاف فراہم کریں، مگر غیر مسلم اقلیتیں اپنے خاندانی معاملات اور مذہبی معاملات میں ان عدالتوں کی پابند نہیں ہوں گی اور ان کے فیصلے ان دو حوالوں سے ان کے مذہب وروایات کے مطابق کیے جائیں گے جس کے لیے عدالتی نظام بھی ان کے اطمینان کے مطابق فراہم کیا جائے گا۔
- جن ممالک میں مسلمان اکثریت یا اقتدار میں نہیں ہیں، وہاں چونکہ وہ ایک سماجی معاہدے کے تحت رہ رہے ہیں، اس لیے اس سماجی معاہدہ (نیشنیلٹی کے قوانین) کی پابندی ان کے لیے ضروری ہے جو وہاں کی ریاستی عدالتوں کے ذریعے ہی ہوگا، البتہ مذہبی معاملات اور خاندانی احکام وقوانین میں ان کے مذہب کے مطابق عدالتی نظام کا فراہم کیا جانا ان کا حق ہے۔ اس حق کے لیے وہ کوشش کرتے رہیں گے اور اس کے لیے ہر ممکن ذریعہ اختیار کریں گے۔ نیز اس ملک کے عمومی قوانین میں اگر کوئی بات قرآن وسنت کے صریح احکام اور مسلمانوں کے کسی اجماعی عقیدہ سے ٹکراتی ہے تو وہ اس کے خلاف احتجاج کریں گے، اسے تبدیل کرانے کی کوشش کریں گے اور حکمرانوں کو اس کی طرف توجہ دلائیں گے اور اگر اس کے باوجود وہ تبدیل نہیں ہوتے تو مسلمانوں کے لیے دو ہی راستے ہیں کہ یا وہ ملک چھوڑ دیں اور یا مجبوری کے درجے میں وہاں رہتے ہوئے اپنا احتجاج مسلسل ریکارڈ کراتے رہیں، مگر قانون کو ہاتھ میں لینے یا مروجہ سسٹم سے بغاوت کرنے کا ان کو اس سماجی معاہدہ کی رو سے حق نہیں ہوگا۔